© rasailojaraid.com

انتہا پسند اسلام سے بھلائی کی توقع!!

فرانسس فوکویاما/ نادیف سمین

مترجم: توراکینہ قاضی

مسلم دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ یہاں ایک طرف خودکش ہائی جیکر اور دوسری طرف سست نہاد اور بے سمت سرمایہ دارانہ معاشرہ کیوں پیدا ہو رہا ہے؟ جہاں نہ معاشی ترقی ہوتی ہے اور نہ ہی جمہوریت پروان چڑھ سکی ہے؟ ان سوالوں کا ایک موزوں مگر جزوی جواب، (جزوی اس لیے کہ یہ اس (مسلم) دنیا کے عرب خطے تک محدود ہے)، اقوام متحدہ کی جولائی میں جاری کردہ رپورٹ برائے ترقی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تمام عرب علاقہ، جیسا کہ اقوام متحدہ کے تخمینے کا ماحصل ہے، اپنی تمام تر تیل کی دولت کے ساتھ ترقی یافتہ کم ہے اور دولت مند زیادہ ہے۔ اس کی معاشیات پر جمود طاری ہے، ناخواندگی عام ہے، سیاسی آزادیاں بمشکل ہی کہیں پائی جاتی ہیں، اور اس کے باشندے بالخصوص خواتین جدید دنیا کی ''صلاحیتوں'' اور ''مواقع'' سے محروم ہیں۔

اقوام متحدہ کی یہ رپورٹ عرب دانشوروں کی ایک جماعت نے مرتب کی تھی جسے گزشتہ ستمبر امریکہ پر ہونے والے حملوں سے کافی پہلے اس کام پر مامور کیا گیا تھا، تاہم مبصرین کے نزدیک ان حملوں سے اس (رپورٹ) کی مناسبت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ نیویارک ٹائمز کے تھامس فرائیڈ مین نے اسے اس ماحول کو سمجھنے کے لیے ایک کلید کہا ہے، جس نے بن لادن ازم کو جنم دیا۔ اور اگر کچھ نہ بدلا تو دوبارہ جنم دے گا۔ وال سٹریٹ جرنل کے ایک اداریے میں لکھا گیا ہے کہ ''اس پر حیرت کی کوئی بات نہیں اگر ایک ایسی الگ تھلگ سی ثقافت، اسلامی بنیاد پرستی کی جنم بھومی بن گئی، جس نے گیارہ ستمبر کے حادثے کو جنم دے دیا''۔

---

*Francis Fukuyama', Nadav Samin "Can Any Good Come of Radical Islam"?, *Commentary*, New York, Sep. 2002, pp. 34-38.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسامہ بن لادن اور اس کے پیروکاروں کی اسلام پسندی کو عرب معاشروں کی ترقیاتی ناکامیوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اسلامی تحریک ان ناکامیوں کے اظہار سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بنیاد پرست اسلام کا ظہور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اسلامی معاشرے کے مدار میں اس کے دوررس اثرات، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ، پیچیدہ ثابت ہوں۔

گزشتہ ستمبر امریکہ پر جو حملے ہوئے وہ مسلمانوں کے ایک ایسے گروہ کا کارنامہ ہے جس کی قیادت افغانستان کے ایک غار میں مقیم دبلے پتلے باریش، تارک الدنیا اور ناقابل فہم بیان داغتے شخص کے ہاتھ میں تھی۔ ان حملہ آوروں کی امریکہ سے ہمہ گیر نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے مقصد کے لیے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دینے کے لیے تیار تھے۔ یہی خصوصیت انہیں دہشت گردوں کی پہلی نسلوں سے جدا کرتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جوش و ولولہ جو جدید جمہوری مزاج سے یکسر نا آشنا ہے، آخر کہاں سے آ گیا؟

بیشتر مبصرین نے ایک فوری تجزیہ کرتے ہوئے گہرے ثقافتی عوامل اور بالخصوص بنیاد پرست اسلام کی تعلیمات کو اس کا سبب قرار دیا۔ اور بلاشبہ اس نقطۂ نظر کی حمایت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بن لادن کی مذمت سے قطع نظر مسلمانوں اور اہل مغرب نے اپنے اپنے طور پر گیارہ ستمبر کے واقعات کی توجیح و تعبیر مختلف انداز میں کی۔ اور اسی سے ہارورڈ کے سیاسی دانشور سیموئیل ہنٹنگٹن، کے پیش کردہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریے کو بھی اعتبار حاصل ہوا۔

پھر بھی جہاں مذہبی یا تہذیبی عوامل کے کردار کو کم بتانا حماقت ہوگی وہاں اسامہ بن لادن کو محض اسلامی بنیاد پرست کا نام دینا بھی کافی نہ ہوگا۔ کیونکہ اسلام ازم جس کی وہ ایک علامت اور ترجمان ہے، کوئی ایسی تحریک نہیں جس کا مقصد اسلامی کردار و اعمال (practice) کی کچھ قدیم ترین شکلوں کو بحال کرنا ہو جیسا کہ بہت سے مبصرین یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس اسلامی تحریک کو ایک روایتی تحریک کے طور پر نہیں بلکہ ایک جدید ترین تحریک کے طور پر زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کی تصدیق ''جرنل آف ڈیموکریسی'' کے تازہ شمارہ میں ایرانی اسکالرز لادن اور رروایا برومانڈ کے مضمون سے بھی ہوتی ہے۔

برومانڈز نے لکھا ہے کہ ''القاعدہ جیسے گروپ بیسویں صدی کے انتہائی دائیں اور انتہائی بائیں بازو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے یورپی نظریات کی اتباع پر قائم کیے گئے ہیں۔ان اثرات کی ایک جھلک حسن البنا[کے نظریات] میں تلاش کی جا سکتی ہے، ایک سکول کے استاد جنہوں نے ۱۹۲۸ء میں مصر میں اخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی۔ حسن البنا نے اٹلی کے فاشسٹوں سے ایک کرشماتی راہنما کی بے چوں و چرا اطاعت کا خیال مستعار لیا۔ اُس کی نیم عسکری تنظیم کا نعرہ ''عمل، اطاعت، خاموشی'' مسولینی کے حکم ''یقین رکھو، اطاعت کرو، لڑو'' کے نمونہ پر تھا۔ نازیوں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اخوان المسلمون کے نوجوان بازو پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اور عملی و روحانی اسلامی جہتوں کے ملاپ کے ذریعے اسلام کو تحرک کے فلسفے میں ڈال دیا۔ یہ بات اچنبھا خیز نہ ہوگی کہ البنا نے اپنے پیروکاروں کو روایتی اسلامی حکومتوں سے حوصلہ افزائی کی نہیں بلکہ جبر و تشدد کی توقع رکھنے کی تعلیم دی۔

اسلام ازم کا ایک دوسرا یورپی ذریعہ یا ماخذ مولانا مودودی کا نام سامنے لاتا ہے، جنہوں نے ۱۹۴۰ء کی ابتدا میں پاکستان میں تحریک، جماعت اسلامی کی طرح ڈالی۔ وہ ایک صحافی تھے جو مارکسی نظریہ و فکر سے خوب آگاہ تھے۔ انہوں نے ''انقلابی ہراول دستہ'' کے ذریعے مغرب اور روایتی اسلام دونوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی وکالت کی جو مغرب اور روایتی اسلام دونوں کے خلاف تھا۔ جب کہ برومانڈز نے تبصرہ کیا ہے ''شاید وہ (مودودی صاحب) پہلے فرد تھے جنہوں نے واضح مغربی اصطلاحات مثلاً ''انقلاب''، ''ریاست''، اور ''نظریہ'' کے ساتھ لفظ ''اسلامی'' کا اسم صفت لگایا۔

یہ انتہائی دائیں اور بائیں لڑیاں بالآخر ایک شخص سید قطب مصری کی صورت میں آپس میں مل گئیں جو جنگِ عظیم دوم کے بعد اخوان المسلمون کے سب سے بڑے نظریاتی راہنما بن گئے۔ ان کی سب سے اہم تصنیف ''معالم فی الطریق'' (Signposts Along the Road) ہے جس میں انہوں نے ایک ایسی واحدانی ریاست کا نقشہ پیش کیا ہے جو ایک اسلامی جماعت کی راہنمائی میں قائم ہو۔ اور اس کے قیام کے لیے انہوں نے تمام متشددانہ طریقوں کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ ان کے ذہن میں جس معاشرے کا خیال تھا وہ غیر جماعتی تھا۔ اس میں آزاد معاشروں کے خودغرض ''افراد'' کا کوئی وجود نہ تھا اور نہ ہی فرد کے فرد کے ہاتھوں استحصال کا کوئی تصور تھا۔ برومانڈز کے خیال میں ''یہ اسلامی پیرہن میں لینن ازم ہے''۔ اور زمانہ حال کے بیشتر اسلامسٹ اس عقیدے کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس زہریلے امتزاج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اگرچہ سنیوں کے ہاں پرورش پائی لیکن شیعی دنیا میں بھی پہنچا اور سب سے زیادہ اس کے اثرات ایران میں آیت اللہ خمینی کے ذریعے ظاہر ہوئے۔ یقیناً انقلاب ایران ۱۹۷۹ء کے دوران ''اسلام پسندی'' (Islamism) کو مذہبی احترام کی سند جاری کر دی گئی جو اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس حقیقت سے کہ یہ تحریک کتنی آسانی سے شیعہ سنی کے درمیان گہری خلیج کو پاٹ سکتی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ اور رواج سے یہ تحریک کس قدر مختلف ہے۔

جیسا کہ برومانڈز نے نتیجہ اخذ کیا ہے، اسلام ازم کی کلید موت کا جمالیاتی تصور تھا: مسلح فوج کی شان وشوکت، شہادت کی بے پناہ طلب اور اپنے اس عمل کی زیادہ سے زیادہ تشہیر۔ اس کی اسلام میں تو کم ہی مثالیں ملتی ہیں لیکن یہ جدید استبدادیت کے واضح خدوخال ہیں۔ اسامہ بن لادن کا ظاہری مذہبیت پر اصرار اس کے متضاد عقائد کی حقیقت کو جھٹلاتا ہے۔

یہاں تک تو نظریاتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، عمرانی پہلو سے اسلام پسندی اور یورپی فاشزم کے عروج کے درمیان بھی ایک قریبی مماثلت موجود ہے۔ اگرچہ ہٹلر نے نظریے کو استعمال کرتے ہوئے جذبات کو ابھارا، لیکن اس کی تحریک کی جڑیں جیسا کہ فرٹز سٹرن جیسے مستند تجزیہ نگار نے اپنی کتاب ''ثقافتی مایوسی کی سیاسیات (The Politics of Cultural Despair, 1974)'' میں تحریر کیا ہے، وسطی یورپ کی تیز تر صنعتی ترقی میں تھیں۔ ایک ہی نسل کے دورانیہ میں لاکھوں کسان شدید گھٹن والی دیہاتی بستیوں سے نکل کر بڑے بڑے غیر شخصی شہروں کی طرف چل پڑے اور اپنے اس عمل سے انہوں نے اپنی مانوس ثقافتی اقدار اور سنگ ہائے میل کے سلسلے گم کر دیے۔

گاؤں سے شہر کی طرف یہ تیز تر نقل مکانی قوم پرستی کے پیچھے ایک نہایت طاقت ور محرک تھی۔ مقامی ذرائع شناخت سے محروم، بے گھر و بے ٹھکانہ دیہاتیوں کو ــــ زبان، قومیت اور سب سے بڑھ کر یورپ کے انتہائی دائیں ہاتھ کے دیومالائی شاعرانہ پروپیگنڈا ــــ کی صورت میں اپنے نئے معاشرتی بندھن ملے۔ اگرچہ دائیں طرف کی پارٹیاں قدیم روایات کی تجدید کا بہانہ تراشتی تھیں یعنی نازی ازم کے لیے قبل از مسیحیت جرمن روایات اور اطالوی فاشزم کے لیے رومن روایات کی تجدید کا، دراصل یہ متضاد نظریات کا ایک معجون مرکب تھا جس میں جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے ذریعے پرانی علامتیں اور نئے نظریات یکجا کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیے گئے۔

جیسا کہ آنجہانی ارنسٹ گیلنر نے سب سے پہلے خیال آرائی کی تھی، 'اسلام پسندی' اسی راستہ پر گامزن ہے۔ گزشتہ کئی عشروں کے دوران بہت سے مسلم معاشرے ایسی ہی عمرانی تبدیلیوں سے گزرے ہیں جن سے انیسویں صدی کے آخر میں یورپ گزرا تھا۔ بڑی تعداد میں دیہاتی اور قبائلی قاہرہ، الجزیرہ اور عمان جیسے شہروں میں آ کر وہاں کی تنگ و تاریک گلیوں میں آن بسے اور اپنے پیچھے دیہاتوں میں فرقوں میں بٹا ہوا نیم خواندہ اسلام چھوڑ آئے۔ اسلام پسندی نے جلد ہی خالص اور یکساں عقائد پر مبنی ایک نئی شناخت پیش کر کے اس خلاء کو پُر کر دیا۔ فاشزم کی طرز پر یہ اجتماع الضدین روایتی مذہبی علامتوں اور زورِ بیان کے ساتھ انقلابی نظریہ کو متحد و مربوط کرتا ہے۔

بعض مبصرین نے گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد یہ خیال آرائی کی ہے کہ اسلام ازم کی افزائش کا اصل محرک غربت ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق، جب انتہائی غربت کے تدارک کا معاملہ درپیش ہو تو عرب دنیا دوسرے ترقی یافتہ علاقوں سے بہتر طور پر مقابلہ کرتی ہے۔ اسلام ازم کی پرورش بھی قبل ازیں یورپی فاشزم کی طرح تیز تر سماجی ابتری سے ہوئی ہے۔ اس کے بیشتر لیڈر اور مختلف شعبوں میں سرکردہ افراد متوسط یا اونچے طبقات میں تازہ وارد ہیں۔ اسلام ازم ان تعلیم یافتہ مگر اکثر تنہا اور [دیگر معاشروں سے] کٹے ہوئے افراد کا تعارف طنجہ سے جکارتہ و لندن تک پھیلی ہوئی ایک عظیم امت سے کرا دیتا ہے۔ کیسٹ ٹیپ ریکارڈر (خمینی کی مثال میں) اور ویڈیو (بن لادن کی مثال میں) کے جادو کے زیر اثر وہ ایک فعال مگر خطرناک اور تباہ کن بین الاقوامی برادری کے رکن بن جاتے ہیں۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ ''اسلام پسندی'' اپنی اصل میں کیا ہے اسے کسی خاص خانے یا ترتیب میں رکھنا آسان نہیں۔ یہ ایک اہم سوال کی طرف، خواہ وہ بظاہر پیچیدہ ہی ہو، ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ فاشزم اور کمیونزم اس سے پہلے غیر ارادی طور پر مسلم معاشروں کے لیے راہ ہموار کرتے ہوئے ان کو جدید بنانے والی قوت کا کام کرتے رہے ہیں، جسے مسلمان تخریبی انداز میں نہیں بلکہ تعمیراتی انداز میں استعمال کر کے مغرب کا چیلنج قبول کر سکتے ہیں!!۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سوال اتنا مہمل نہیں جتنا کہ معلوم ہوتا ہے۔ اس مقام پر تقابل اکثر فریب دیا کرتے ہیں۔ لیکن بالشویک ایک صنعتی اور شہری روس بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ ہٹلر نے مہاجنی نظام سے چھٹکارا پانے کا بندوبست کرلیا اور جنگ سے پہلے کا جرمنی جس طبقاتی گروہ بندی کا شکار تھا، اس سے بھی نجات حاصل کر لی۔ اس انتہائی پرصعوبت اور مہنگے طریقے سے ان دونوں ''ازموں'' نے جدیدیت سے پہلے کی ان رکاوٹوں کا خاتمہ کردیا جنہوں نے آزاد جمہوریت کی نمو اور ترقی کو روک رکھا تھا۔ بلاشبہ جدیدیت کی طرف زیادہ محفوظ اور پرامن راہیں بھی جاتی ہیں جنہیں کوریا، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اختیار کیا۔ اور یقیناً نسبتاً کم مہنگے راستے روس اور جرمنی کو بھی میسر تھے۔ لیکن آدمی کو اسی سے معاملہ کرنا ہوتا ہے جو اس کے سامنے ہوتا ہے۔ اور اسلامی ثقافتوں کے بارے میں مدلل طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ابھی بہت سے مسائل کا خاتمہ کرنا باقی ہے۔ اگر اسلام پسندی کا رخ اس طرف پھر جائے کہ جتنا آج وہ مغرب کے خلاف ہے اتنا ہی اپنی روایتی شکلوں کے خلاف ہو جائے تو کیا یہ بھی ایسی ہی تخلیقی توڑ پھوڑ کا ماخذ بن سکتا ہے؟

ان گنت ایسے طریقے ہیں جنہوں نے اسلام پر عمل اور تبدیلی کو روک رکھا ہے۔ یہ ایک جامد قانونی ڈھانچے میں مقفل ہے۔ مورخ اقتصادیات تیمور کوران نے بڑی محنت سے ان روایتی اسلامی اداروں کی تفصیلات جمع کی ہیں جن کی بے لچک سختی اور ضابطہ پرستی نے ترقی کی راہ میں بھاری رکاوٹیں حائل کیے رکھیں۔ شرح سود مذہبی علماء مقرر کرتے ہیں، سکولوں اور مدرسوں میں مذہبی درسی کتب کا رٹا لگوایا جاتا ہے، اور مدرسوں کی تعلیم تنقیدی سوچ کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ عورتوں کو سیاسی اور معاشی زندگی سے باہر رکھا جاتا ہے، علی ہذا القیاس - یہاں تک کہ وقف کا ادارہ یا روایتی اسلامی خیراتی ادارہ جو ایک اصلاح شدہ اسلامی نظام میں سول سوسائٹی کا تحفظ کرسکتا ہے، اب تبدیل شدہ حالات سے تطابق کے کسی موقع کے بغیر امیر افراد کی ایک دائمی جائیداد بن کر رہ گیا ہے۔

تاریخی طور پر ایسی بہت سی مشکلات یہود و عیسائی مغرب میں بھی موجود تھیں، لیکن ایک طویل جدوجہد کے بعد یا تو ان کو نابود کردیا گیا یا ان کا اندمال کردیا گیا۔ یہ سب خرابیاں زمانہ حال کے اسلام میں مسلسل موجود ہیں اور ان کو صرف سیاسی طاقت کو حرکت میں لانے ہی سے دُور کیا جاسکتا ہے۔ اسلام پسندی نے پہلے ہی اس صلاحیت کا مظاہرہ کردیا ہے، بلکہ جہاں ضروری ہوا وہاں مغربی مثال کو بھی اپنایا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ ہر چند کہ امام خمینی عورتوں کے لیے چادر اور نقاب واپس لے آئے ہیں لیکن انہیں ایرانی انتخابات میں بادلِ نخواستہ عورتوں کو ووٹ کا حق دینا پڑا۔ (یہ شاہ کی حکومت کا کارنامہ تھا) اور یہ ایسا کام تھا جسے انہوں نے ایک دفعہ عصمت فروشی سے تشبیہ دی تھی۔

مصر میں اخوان المسلمون اور دیگر یہاں تک کہ اس سے بھی زیادہ بنیاد پرستانہ تنظیموں نے خاندان اور ریاست کے مابین رضا کار اداروں کے ذریعے ایک رابطہ قائم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۲ء میں قاہرہ کے زلزلے کے وقت اسلامی خیراتی اداروں نے موقع پر پہنچ کر ایسی خدمات انجام دیں جو سست نہاد اور بدعنوان مصری ریاست کے بس کی بات نہ تھی۔ اسلام پسند اس بارے میں بے حد پرامید ہیں کہ وہ ایک نہ ایک دن مذہب اور سیاسی قوت کو متحد کر دیں گے، جو ایک تباہ کن بات ہوگی۔ مگر وہ اتحاد و روابط اور آزادانہ عمل کا سبق سیکھ اور ذہن نشین کر رہے ہیں۔ اگر کسی طرح وہ اپنے بنیاد پرستانہ نظریے (آئیڈیالوجی) سے جدا ہو جائیں تو ایک حقیقی سول سوسائٹی کی بنیادیں رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک اور میدان ہے جس میں اسلام پسندوں کے ردِعمل پر مبنی خیالات ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کر سکتے ہیں، اور اس کا تعلق اسلامی دنیا میں بنیادی وسائلِ حاکمیت اور اس کی قانونی حیثیت سے ہے۔

اسلامی فقہ کا روایتی نظام کم از کم انیسویں صدی سے اپنے غیر لچکدار اصولوں اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح حملہ کی زد میں رہا ہے۔ اس کوشش میں ایرانی نژاد جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء-۱۸۹۷ء) اور ان کے شاگرد مصری مصلح محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء-۱۹۰۵ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبدہٗ ان اولین لوگوں میں سے تھے جنھوں نے دین کی تفسیر و تعبیر کی بے لچک صورت سے علیحدگی اختیار کی جو اولین خلافتوں سے سُنی دنیا کی خاصیت چلی آ رہی تھی۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق قرآن اور سنّت (احادیث نبویؐ) کے بنیادی حقائق کے اطلاق کے لیے عقلِ انسانی ہی ایک مناسب آلہ کار تھی۔ جب عبدہٗ اپنی زندگی کے آخری حصے میں مصر کے مفتی مقرر ہوئے تو انہوں نے ایسے احکامات جاری کیے جو بقول ایک اسکالر ان کی اس خواہش کی عکاسی کرتے تھے کہ ''مذہب اسلام کو بالکلیہ طور پر جدید تہذیب کی ضروریات سے ہم آہنگ بنا دیا جائے''۔

اس تبدیلی کے مضمرات بہت عمیق تھے۔ اگرچہ کٹر سنّی اسلام کی اداراتی بنیاد اپنی جگہ قائم رہی، مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت سے سربہ مہر مذہبی قوانین کی تفسیر کے ابواب کی چولیں ہل گئیں۔ مارٹن لوتھر لنگ کی طرح عبدہٗ نے اپنے رہبر افغانی“ کے زیر اثر مذہبی مقتدریت کا محکمہ تہ و بالا کر دیا، اور آزاد فقہی ترجمانی کو پھر سے زندہ کر دیا۔ ان کی مثال نے بعد میں آنے والے شارحینِ روایات و احادیثِ اسلام کے لیے خواہ وہ اولیاء ہوں یا خطیب، ایک نظیر قائم کر دی۔ موخرالذکر میں مغرب مخالف بنیاد پرستوں مثلاً اخوان المسلمون کے سید قطب“ اور اب اسامہ بن لادن کے نام بھی گنائے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی ترجمانی کی قوت کے حصول کی لڑائی میں یہ کوئی حسنِ اتفاق کی بات نہیں کہ اسلام پسندی کے لیے ابتدائی پرورش گاہیں سعودی عرب اور مصر کی ناپائیدار امارتیں رہی ہیں۔ دونوں ملکوں نے روایتی مذہبی علماء کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اسلام کی عوامی لہر کو پچھلی گلیوں، کوچوں اور مسجدوں میں دھکیل دیا۔ اور اسے ایک نظریاتی گوریلا تحریک میں بدل دیا۔ اسلامی روایت کی لنگر گاہوں سے ٹوٹ کر اسلام پسندوں نے اپنے آپ کو دینی تعلیمات اور اصول وضوابط کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور اپنے انقلابی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنے کا ماہر ثابت کیا۔

اسامہ بن لادن کا ۱۹۹۸ء کا مشہور فتویٰ جس میں اس نے امریکہ اور ہر امریکی کے خلاف اعلان جہاد کیا، اس نکتہ کی ایک مثال ہے۔ اگرچہ اس اعلان کا متن اسلامی روایتی اخلاقی تعلیمات کے منافی ہے، جیسا کہ مشرقِ وسطیٰ کے مشہور دانشور برنارڈ لیوس کا مشاہدہ ہے: ”کسی مقام پر بھی اسلام کا بنیادی متن دہشت گردی اور قتل کو جائز قرار نہیں دیتا“۔ اس فتویٰ میں سب سے بڑھ کر قابل ذکر انتہا پسند شے اس کے مصنف کی شخصیت ہے۔ اسلامی روایتی عمل کے مطابق اسامہ بن لادن کوئی ایسی مستند مذہبی یا فقہی حیثیت کا مالک نہیں کہ کوئی فتویٰ جاری کر سکے۔ یہ تو اس طرح ہو گیا جیسے ہٹلر نے پاپائی گشتی فرمان جاری کر دیا یا لینن نے روسی آرتھوڈوکس کلیسا کا حکمنامہ جاری کر دیا۔ صرف اسی حقیقت سے کہ اسلامہ بن لادن یہ روایتی حد عبور کرنے کے لیے تیار تھا، ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام پسندی نے کس حد تک روایتی اسلامی فقہی اختیار کو پائمال کیا ہے۔ مگر قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ جو حد مغرب کے خلاف جنگ کرنے کے لیے عبور کی جا سکتی ہے اسے زیادہ صحت مند اور مفید مقاصد کے حصول کے لیے بھی تو عبور کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں خود فریبی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام کی فوری تجدید انتہائی مشکل ہے اور یہ بڑے پیمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی معاشرے میں کئی گہری گڑی ہوئی رکاوٹیں ہیں۔ ان میں صرف یہی نہیں کہ بالعموم مشاہدہ کی جانے والی سیکولر سیاسیات کی روایت مسلم معاشروں میں بہت کم ہے۔ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک جو چیز زیادہ قدرتی دکھائی دیتی ہے وہ ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ ہے جو معاشرے اور ریاست کو ایک انقلابی اکائی کی صورت میں اکٹھا کر دے۔ باوجود اقوام متحدہ کی رپورٹ کے یہ بھی واضح نہیں کہ مسلم دنیا حقیقت پسندانہ خود تشخیصی کے قابل ہے جو تجدیدی تبدیلی کے ظہور کے لیے ضروری ہے۔

بہت سے غیر مغربی معاشروں نے مغرب کی بے پناہ فوجی، اقتصادی اور ثقافتی طاقت کو روکنے کے لیے تشدد کی راہ آزمائی۔ چین اور جاپان جیسے ملکوں نے اُس وقت، برنارڈ لیوس کے الفاظ میں "غلطی کہاں ہوئی؟" کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا شروع کیا جب انہیں شکست اور تسلط کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ مغرب کو نہ ہرا سکے تو اپنی ثقافتوں کی اصل بنیاد کو قائم و محفوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اس کے ساتھ مل کر اس کے مختلف ادارے اپنا لیے۔ سماجی تفہیم کا یہ عمل مسلم معاشروں میں بہت سست رفتار رہا ہے۔ بالخصوص عربوں میں جو بڑے تسلسل سے اپنی غیر ترقی یافتگی کا الزام امریکہ اور اسرائیل پر دھرتے رہتے ہیں۔

اگر مسلم جدیدیت کا انتظار طویل اور صبر آزما معلوم ہوتا ہو تو مغرب کو قلیل مدت میں کس طرح جواب دینا چاہیے، جبکہ اسے مسلسل دہشت گردی، خودکش بمباری اور ہلاکت آفرین ہتھیاروں کا سامنا ہو؟ اس جواب کا ایک حصہ یہ ہے کہ اسے حتمی فوجی طاقت استعمال کرنی چاہیے۔ یورپی فاشزم اس لیے نہیں ختم ہو گیا کہ اس کے حیات آفرین نظریات میں کوئی اندرونی خرابی یا کمزوری تھی بلکہ اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب میدانِ جنگ میں اسے کچل دیا گیا۔ اسامہ بن لادن اور اس کے مقاصد کو گیارہ ستمبر کے کامیاب حملوں سے تائید و حمایت حاصل ہوئی۔ اس طرح افغانستان سے القاعدہ کا فرار اور بنیاد پرست اسلامی دہشت گردوں کے خلاف امریکہ کی مسلسل کارروائیاں اسلامی جوش و جذبہ کو دھیما کرنے کی یقینی کلید ہیں۔

مگر سب سے اہم جدوجہد اسلامی دنیا کے اندر خود اس کی طرف سے ہونی چاہیے۔ بہت عرصہ تک سچے مسلم جدّت پسند الگ بیٹھے رہے۔ جبکہ روایت پسند اور اسلام پسند مرکزی سٹیج پر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مغرب شناس مسلمان گیارہ ستمبر کے حادثے کی ہلچل سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فائدہ اٹھائیں اور اپنے مذہب کی اصلی لبرل صورت کو زیادہ سے زیادہ سامنے لائیں۔

یہ سوچنے کی وجہ موجود ہے کہ اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگر چہ بہت سے مسلمان اسلام پسندی کی حمایت اس کی مجرد صورت میں جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن اس تحریک نے ہر اس جگہ جہاں اسے طاقت حاصل ہوئی، تباہ کن ریکارڈ چھوڑا ہے۔ سعودی عرب جو بنیاد پرست اسلام کی متعصب ترین وہابی شاخ کا گھر ہے، عصرِ حاضر کی دنیا کی سب سے ناقص اور بدانتظام حاکمیت ہے۔ حتیٰ کہ تیل کی وسیع دولت رکھنے کے باوجود یہاں فی کس آمدنی ۱۹۸۰ء میں ۱۱۵۰۰ ڈالر سے ۱۹۹۹ء میں ۶۷۰۰ ڈالر تک گر گئی۔ جہاں تک طالبان کے افغانستان کا تعلق ہے، عام افغانوں نے ان کے تسلط سے رہائی پا کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑے ذوق وشوق سے دوبارہ عیش وعشرت کے سادہ وجدید لوازم مثلاً اپنے مدت مدید سے دفنائے ہوئے وی سی آروں پر مصالحے دار بھارتی فلموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

یہ ایرانی ہیں، جو گزشتہ ایک نسل سے اسلامی حکومت کے تحت زندگیاں بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس کا امکان موجود ہے کہ وہ موجود پرآشوب دور میں دنیائے اسلام کی قیادت کریں گے۔ اگر چہ مغرب نے جو امیدیں بظاہر اصلاح شدہ ذہن والے صدر خاتمی سے وابستہ کر رکھیں تھیں وہ غلط ثابت ہوئی ہیں، تاہم ایک بنیادی آبادیاتی حقیقت آزاد خیالی اور رواداری کے حق میں کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ کہ ایران کی ستر فی صد آبادی اب تیس سال سے کم عمر کی ہے اور سب رپورٹیں بتاتی ہیں کہ نوعمر لوگ اسلامی تھیا کریسی سے نفرت کرنے کی طرف مائل ہیں۔ ایران جہاں پہلی اسلام پسند حکومت اقتدار میں آئی، اگر اپنی ہی بھاپ (یعنی عوامی طاقت سے) لبرلائزیشن کے راستے پر چل پڑے، تو وہ باقی شرقِ اوسط —— بلکہ اس سے بھی پَرے —— کے لیے ایک مضبوط مثال قائم کر سکتا ہے۔

آخر میں —— جہاں اسلام ازم کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا غلط ہے وہاں اس کی طاقت کا کم اندازہ لگانا بھی اتنا ہی خطرناک ہے۔ اس کے پاس باقی مسلم دنیا تو کجا عربوں کو دینے کے لیے بھی کم ہی کچھ موجود ہے۔ اپنے تشدد کی عظمت ورفعت کو جس طرح یہ لوگ بیان کرتے ہیں اس نے پہلے ہی ایک شدید قسم کا ردِ عمل پیدا کر رکھا ہے۔ اور بشرطیکہ اسے شکست نہ دے دی گئی ہے، اس کی کامیابیاں خود ممکن ہے کہ طویل عرصہ سے معرضِ التوا میں ڈالی ہوئی اصلاح کے لیے راہ ہموار کر دیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ یقیناً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلی بار نہ ہوگا کہ تاریخ کی فریب کاری ایسے تعجب خیز نتیجے کو ظہور میں لائی۔

[فرانسس فوکویاما جان ہاپکنز سکول آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز (SAIS) میں "بین الاقوامی سیاسی اقتصادیات" کے پروفیسر ہیں اور تازہ ترین کتاب *Our Posthuman Future* کے مصنف ہیں۔ نادیف سمین اسی ادارے (SAIS) کے تازہ فارغ التحصیل گریجوایٹ ہیں، جو مطالعات مشرقِ وسطیٰ میں تخصص حاصل کر رہے ہیں۔]

© rasailojaraid.com